اے۔آر۔کارنیلیس

ترجمہ: ممتاز احمد

مذہب اور بنیادی انسانی حقوق

[سپریم کورٹ آف پاکستان کے سابق چیف جسٹس اے-آر- کارنیلیس نے ۷ جولائی ۱۹۶۵ء کو ''نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن- کراچی'' کے زیر اہتمام محکمہ سماجی بہبود کے افسران کے تربیتی کورس میں زیرِ نظر تقریر کی تھی۔ تقریر میں اُس وقت کے ''دستور پاکستان (۱۹۶۲ء)'' کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے، مگر دستور کی جن دفعات اور بالخصوص ''قراردادِ مقاصد'' کا حوالہ دیا گیا ہے، یہ ۱۹۷۳ء کے دستور میں بھی شامل کر لی گئی تھیں، اور آج بھی دستور کا حصہ ہیں، بلکہ بعدازاں ایک ترمیم کے نتیجے میں ''قراردادِ مقاصد'' کو جو ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء اور ابتداءً ۱۹۷۳ء کے دساتیر میں دیباچے کی حیثیت رکھتی تھی، دستور کے متن میں شامل کر لیا گیا ہے۔ جناب جسٹس کارنیلیس کی تقریر کا زیرِ نظر ترجمہ ماہنامہ ''چراغ راہ'' (بابت جنوری ۱۹۶۷ء) میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ وقت گزرنے کے باوجود جسٹس کارنیلیس کی تقریر ہمیں آج بھی دعوتِ عمل دیتی ہے۔ مدیر]

آج ایک بار پھر خوش قسمتی سے مجھے یہ موقع مل رہا ہے کہ میں اپنے پسندیدہ موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ عدالتی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے دوران اپنے دستور کی بنیادی دفعات کا تجزیہ و تعبیر کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا ہے کہ ایک دستوری ارتقاء تو خود میرے ذہن میں بھی جاری ہے۔ یہ بنیادی دفعات جن کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ دفعات ہیں جو ''قرارداد مقاصد'' کا

حصہ تھیں اور آج ہمارے دستور کے مقدمے میں مندرج ہیں۔ یہ وہ دفعات ہیں جو ملک میں قانون کی حکومت، بنیادی حقوق اور عام حکمت عملی کے اصولوں کا تعین کرتی ہیں۔

اپنی بات شروع کرنے سے پہلے اپنی ایک سابقہ تقریر کا حوالہ دوں تو شاید بے جا نہ ہوگا، یہ تقریر ۱۹۶۱ء میں میں نے منشورِ حقوقِ انسانی کی تیرہویں سالگرہ کے موقع پر کی تھی۔ اُس وقت اس منشور پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ انسانی زندگی کی تعمیر میں مذہب کو جو غیر معمولی مقام حاصل ہے، اس منشور میں اس مقام کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یہ منشور سیاسی و معاشرتی شعبہ ہائے حیات میں نہایت ہی بلند بانگ اصولوں کے احیاء کا مدّعی تو ہے، مگر ان اصولوں کو تعمیری رُخ کی طرف موڑنے والی طاقت اور ان کے پس منظر میں کام کرنے والی قوتِ نافذہ کو بھول جاتا ہے۔ میں نے تو یہ تک کہہ دیا تھا کہ ''یہ ایک طرح کی منافقت ہے جس کا مظاہرہ قانون کی پناہ لے کر کیا گیا ہے۔'' میں نے کہا تھا کہ ہم ایشیائی لوگوں کے نزدیک ''معاشی آدمی'' یا ''سیاسی آدمی'' کوئی وقعت نہیں رکھتا، ہمارے ذہنوں میں انسانی زندگی کا اہم ترین پہلو ہمیشہ کی طرح اب بھی کسی شخص کی مذہبی زندگی ہے۔ ہمارے نزدیک ہر شخص کا بنیادی وجود اِس کا اخلاقی وجود ہے جس کے بل پر وہ اپنے فرائض میں اس طرح کوشاں رہتا ہے کہ جب یوم الحساب آئے اور اُس کا خالق اُس سے اُن تمام اعمال کا حساب لے جو اُس نے اپنی زندگی میں انجام دیے تھے تو وہ ایک سچے آدمی کی طرح پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہو سکے۔ اس طرح مذہب انسان کی معاشرتی، سیاسی اور معاشی زندگی کے اعمال میں ایک سرچشمہ ہدایت کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور ان سب اعمال میں اُس کے نزدیک سوائے حق کے اور کوئی چیز معیار نہیں بن سکتی۔ میں نے اپنی اس تقریر میں یہ بھی کہا تھا کہ ایشیا کے افق سے غیر ملکی تسلّط کے خاتمے پر وہ لادینی رجحانات آہستہ آہستہ کم ہو رہے ہیں جنہیں غیر ملکی حکمرانوں نے اپنے مفادات کی بنا پر پروان چڑھایا تھا۔ اب مذہب بتدریج ایک مؤثر قوت کی حیثیت سے زندگی کے تمام امور پر حاوی

ہو رہا ہے۔ میں نے اپنی تقریر کے اختتام پر جو معروضات پیش کی تھیں، وہ یہ تھیں۔

میرا خیال ہے کہ انسانی حقوق کا یہ عالمگیر منشور محض لادینی ریاستوں کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ اس منشور کے پیچھے جو قوتِ نافذہ تجویز کی گئی ہے وہ تین طرح کی ہے۔

۱- سماجی شعور ـــــ جو انفرادی اخلاقی شعور اور ذاتی ضبط و نظم کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۲- معاشی شعور ـــــ جو مساوات کے نظریے سے متصادم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

۳- سیاسی شعور ـــــ جو بظاہر قنوطیت پر ہی منتج ہوتا ہے۔

میرا یقین ہے کہ جان دار محفوظ اور مضبوط قوتِ نافذہ مذہبی شعور سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے، پس اس منشور کو اگر دنیا کے غالب حصّے میں کوئی موثر کردار ادا کرنا ہے تو اسے اپنے متن میں مذہب کو قرار واقعی جگہ دینی ہوگی۔

میں نے یہ باتیں پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ عرض کی تھیں۔ بعد میں مجھے یہ دیکھ کر ذاتی طور پر خوشی ہوئی کہ ۱۹۶۲ء میں جو دستور نافذ کیا گیا، اس میں اسلام کے عطا کردہ، ''آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف'' کے اصولوں کو اہم مقام دیا گیا ہے۔ دستور میں یہ بھی مذکور تھا کہ ان اصولوں پر عمل درآمد جمہوری طریقوں سے ہوگا۔ بہ الفاظ دیگر اس دستور کی رو سے اصل قوت اُن افراد یا افراد کے اس گروہ کو نہیں دی گئی جو برسرِ اقتدار آ جائے، بلکہ ایک ایسا طریق کار وضع کیا گیا جس کے مطابق عوام اپنے منتخب کردہ نمائندوں کی وساطت سے خود ہی اپنی فلاح و بہبود کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے۔

معاشرتی بدنظمی کا شعور ہمیں سماجی فلاح و بہبود کی ضرورت کا احساس دلاتا ہے۔ میں یہاں اس مسئلے پر گفتگو کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا کہ ہمارے ملک میں معاشرتی بدنظمی کی نوعیت کیا ہے اور کن تاریخی وجوہ کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ مختصراً اتنی بات ضرور عرض کروں گا کہ جس

طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیانت دار پیدا کیا، لیکن ملکیت کی ہوس نے اُسے بددیانت بنا دیا، اسی طرح یہ بات بھی صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو مساوی پیدا کیا، لیکن ان کے درمیان قوت واقتدار کے ہمہ پہلو مطالبات نے جو بہر حال ان ہی کے تحفظ اور مفاد میں تھے، انسان اور انسان کے درمیان تفریق پیدا کر دی۔ عدمِ مساوات کی اس کیفیت کو برقرار رکھنے میں معاشرتی استحکام اور اتحاد کے مطالبات بھی اہم عامل رہے ہیں۔ آج ہر ملک میں آپ کو ایسے افراد اور طبقات مل جائیں گے جو مستقل طور پر نہایت ابتر حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور اُن کی بہترین کوششیں بھی انہیں بہتر معیارِ زندگی مہیا کرنے سے قاصر ہو رہی ہیں۔

ہمارے ہمسایہ ملک میں ذات پات کی کڑی تفریق کا نظام اس کی واضح مثال ہے۔ ہوسکتا ہے جب یہ نظام قائم کیا گیا ہو، اُس وقت یہ معاشرے کے لیے مفید اور ضروری ہو، لیکن دورِ جدید میں بنیادی انسانی حقوق کے تناظر میں اس کا وجود باعثِ شرم ہے۔ یہ امر نہایت خوش گوار ہے کہ ہمارے ملک کا ماضی اس طرح کی ناکارہ روایات سے پاک ہے اور یہ ملک اسلام کے ایک ایسے جان دار ورثے کا امین ہے جو تمام انسانوں کو مساوی قرار دیتا ہے اور جس کے تحت معاشرے میں ہر فرد برابر کے مواقع کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ اصولاً اس نظریے کے ساتھ ہمارے تمام تر خلوص کے باوجود انسانی تنظیموں کے قیام کے ساتھ بعض مختلف نظاموں کا ارتقاء ہوتا رہا ہے۔ اُن کی ضروریات نے اکثر و بیشتر انسان اور انسان کے درمیان عدم مساوات پیدا کی ہے اور افراد نے مساوی طور پر نہیں، بلکہ مختلف سطحوں پر اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں سے استفادہ کیا ہے۔ مطلق العنان اور شاہی حکومتوں کے دور میں اقتدار اور قوت کا معیار ملکیتِ زمین تھا اور انسانی عزّ و شرف کا اصل مستحق وہی شخص سمجھا جاتا تھا جو زیادہ سے زیادہ زمین کا مالک ہو۔ وہ تمام لوگ جو بڑے بڑے جاگیرداروں اور مالکانِ زمین کے ماتحت کام کرتے تھے، استحصال، جبر اور غلامی کا شکار تھے، اور بنیادی انسانی حقوق سے محروم تھے۔ آہستہ آہستہ یہ صورتِ

حال ختم ہوئی اور جاگیرداروں کا تسلط کم ہوا، لیکن یہ تبدیلی اس وجہ سے نہیں آئی کہ جاگیرداروں میں اب انسانی عظمت کا شعور پیدا ہوگیا ہے، بلکہ اکثر ممالک میں اس تبدیلی کا باعث صنعتی انقلاب کا آغاز تھا۔ صنعتی انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین کے بجائے دولت انسانی شرف کا معیار ٹھہری اور سرمایہ دار دولت ہی کے بل بوتے پر جاگیرداروں کو ختم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس دولت کو برقرار رکھنے کے لیے اور اس میں مزید اضافہ کرنے کے لیے سرمایہ داروں نے جبر کا ایک اور طریقہ اختیار کیا اور وہ تھا مزدوروں کا استحصال۔ نیا پرولتاری طبقہ جو زمین سے پہلے ہی محروم ہو چکا تھا، اب پوری طرح کارخانہ داروں کے رحم و کرم پر تھا جو ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر انھیں کم سے کم اجرت دیتے اور زیادہ سے زیادہ کام لیتے۔ اس صورتِ حال سے بے شمار معاشرتی برائیوں نے جنم لیا۔ مزدوروں کے ساتھ غیر انسانی سلوک، کساد بازاری کی بنا پر یا کارخانہ داروں کے ظالمانہ اقدامات کی وجہ سے مزدوروں کی جبری بے روزگاری، ناکافی رہائش گاہیں، غرض اس طرح کے کئی دوسرے عوامل نے مل کر تقریباً تمام جدید صنعتی معاشروں کو داغ دار کر دیا، کسی ایک طبقے کا اقتدار اور قوت قائم اور برقرار رکھنے کی اُن کوششوں نے، خواہ وہ جاگیردارانہ تسلط کے توسط سے ہوں یا مزدور طبقے کے روزگار کو کنٹرول کرنے کے ذریعے سے، صرف معاشی زندگی ہی کو نہیں، بلکہ معاشرے کے پورے نظامِ زندگی کو متاثر کیا۔ اونچے طبقے کے خصوصی مفادات مستقل نوعیت اختیار کرنے لگے اور کرائے کے دانشوروں کی کوششوں سے ان مفادات کا تحفظ اس طبقے کے نزدیک بھی ضروری سمجھا جانے لگا جس پر ان مفادات کی براہِ راست زد پڑ رہی تھی اور جو اس نظام جبر کا ہدف بنا ہوا تھا۔ یہ طبقہ غلامی، فرماں برداری، اور اطاعت کو صدیوں کی روایت کے باعث اپنے کردار کا خاصہ بنا چکا تھا اور اب حالت یہ تھی کہ روٹی کے چند ٹکڑے اور جسم ڈھانپنے کے لیے کچھ کپڑا انہیں مطمئن کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اور کوئی بھی مذہبی معلّم انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر سکتا تھا کہ جن حالات میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں، وہ عین فطری اور ناقابل تغیّر ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے حکماء کو عوام الناس میں یہ اعتقاد ختم کرنے کے لیے زبردست فکری کوششیں کرنا پڑیں کہ وہ حالات جن میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں، خدا کی طرف سے اُن کے لیے مقدر ہو چکے ہیں۔ تقریباً ۱۲۵ سال بعد ان فکری کوششوں کا ٹھوس نتیجہ بھی برآمد ہوا اور ۱۹۱۷ء میں روس میں مارکسزم کی بنیاد پر انقلاب برپا ہوا۔ اس انقلاب کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہ مذہبی اعتقادات سے محروم تھا۔ نئے اقتدار کی لادینیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ پہلے سے زیادہ جبر کا شکار بنائے جانے لگے۔ اس نئے نظامِ جبر نے نئی معاشرتی برائیوں کو جنم دیا جنھیں دور کرنے کے لیے آج اشتراکی ممالک کا ذمہ دار اور سمجھ دار طبقہ مختلف تدابیر آزما رہا ہے اور اس مشکل سے نجات پانے کے لیے سوائے مذہب کے ہر چیز سے مدد حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہے، مختلف معاشرتی طبقات کے درمیان مساوات قائم کرنے کی کوشش خواہ وہ کسی نظریے کی بنیاد پر ہی کیوں نہ ہو، قابلِ تعریف ہے۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو مساوی پیدا کیا ہے۔ بنیادی حقیقت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم میں بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے شخص کو بھی انسانی شرف آزادی اور دوسرے انسانوں کے مقابل اپنے مساوی حقوق کا گہرا شعور اور اپنے مذہبی فرائض کا جان دار احساس ہو۔ اگر کسی قوم کے افراد میں یہ خصوصیات موجود ہیں اور وہ قوم اپنے ملک کی زمین اور اس کی روایات سے جذباتی وابستگی کا بھی شعور کر سکتی ہے تو وہ ایک مضبوط اور مستحکم قوم ہوگی اور خدا کی راہ میں اخلاقی برتری کے لیے اس کی کوششوں میں کوئی چیز بھی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہمارے دستور میں یہ ساری چیزیں موجود ہیں اور ہماری ''قراردادِ مقاصد'' میں صاف صاف ''آزادی، مساوات، رواداری اور اسلام کی بنیادوں پر قائم ہونے والا معاشرتی عدل کا نظام'' نہ صرف مذکور ہے، بلکہ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''پاکستان کے عوام اس ملک میں ان اصولوں پر مکمل عمل درآمد کے خواہاں ہیں۔'' آپ دیکھ سکتے

ہیں کہ ہمارے نظریے میں اور سوشلزم کے نظریے میں کس قدر فرق ہے۔ سوشلزم میں جس چیز پر زور دیا گیا ہے وہ ہے مادی ترقی۔ بہ الفاظ دیگر سوشلزم میں جو چیز مطلوب ہے، وہ یہ ہے کہ جدید سائنس کی عطا کردہ صنعتی مشینیں مناسب تعداد میں اشیائے صرف پیدا کرتی رہیں، اور وہ اشیائے صرف مناسب تعداد میں صارفین کو پہنچتی رہیں، چونکہ یہ سارا مرحلہ کا راخلاقی ضابطے سے عاری ہے، لہٰذا یہ ناگزیر ہے کہ اس نظام میں بے رحم اور سنگ دلانہ معاشی تفوق کا بازار گرم ہو اور طاقتور کمزوروں کو دبانا شروع کر دیں۔ متعدد ممالک میں اس صورت حال کی واضح مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں اور ہم روزانہ اس طرح کی مثالوں سے دوچار ہوتے رہتے ہیں، لیکن یہ بات طے ہے کہ کوئی معیشت دان اور کوئی قوت معاشرتی عدم مساوات کے مسئلے کو پُر امن طور پر اُس وقت تک حل نہیں کر سکتی جب تک وہ خود مذہبی اخلاقی شعور سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کے نفاذ کا بھی ارادہ نہ رکھتی ہو۔ پس یہ بات لازمی ہے کہ جہاں ہم معاشی زندگی کو معاشرتی کوائف سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں، وہاں ان دونوں کا تعلق اخلاق سے بھی جوڑیں اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے دستور میں اس چیز کو غالب حیثیت دی گئی ہے۔

دوسرے ممالک میں مذہب سے جو کام لیا جاتا ہے اُس کی نوعیت مختلف ہے۔ ان ممالک میں مذہبی رہنما اپنے پیروکاروں میں سے اُس طبقے کی بھلائی کے لیے کام تو کرنا چاہتے ہیں جو ابتر حالات میں زندگی بسر کر رہا ہے، لیکن وہ اقتدار، قوت اور دولت کے مقابلے میں اپنے آپ کو بے بس پا کر موجودہ حالات پر ہی قانع ہو جاتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک بار صاف صاف اعلان کر دیا جائے کہ مذہب موجودہ ناگفتہ معاشی اور معاشرتی حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا اور مذہبی رہنماؤں کا یہ فرض ہے کہ وہ ناکارہ معاشرتی اداروں کی اصلاح کی ذمہ داری اپنے سر لیں۔ پاکستان میں صورتِ حال مختلف ہے۔ یہاں کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام کے سماجی نظریات یہ اور یہ ہیں، کیونکہ یہ بات تو دستور میں صاف صاف درج ہے کہ معاشرے کا

سارا نظام ہی اسلام کے مطابق چلایا جائے گا۔اس واضح ہدایت کی موجودگی میں بھی اگر ہماری انتظامیہ کے افسران معاشی اور سماجی مجبوریوں کے پیش نظر مذہبی احکامات اور اخلاقی ضابطوں کو ثانوی حیثیت دیں تو اُنہیں معاف نہیں کرنا چاہیے۔ ہماری انتظامیہ کو اپنے تمام اقدامات میں جس اصول کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے، وہ اصول یہ ہے کہ صحت مند معاشرتی زندگی صحت مند اخلاقی ضابطوں کے بغیر ممکن نہیں ہے، اور صحت مند اخلاقی ضابطے وہی معتبر ہیں جن کی بنیاد مذہبی ایمانیات پر ہو۔پس پاکستان میں اسلام کا رول محض منفی یا اصلاحی نوعیت ہی کا نہیں ہے، بلکہ اس پر معاشی اور سماجی زندگی کی تعمیر کی مثبت ذمہ داری بھی ڈالی گئی ہے۔دوسرے ممالک میں دنیوی امور سے طویل علیحدگی کے بعد مذہبی معلمین کو آج اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کریں کہ انسانی زندگی کے مادی اور اخلاقی پہلو ایک ہی اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس دنیا کی چیزوں کو دوسری دنیا کی چیزوں سے الگ نہیں کیا جاسکتا، لیکن پاکستان میں حکومت اور شہریوں، دونوں کو اس امر کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ اسلام کی عطا کردہ ہدایات کی روشنی میں غربت، افلاس اور بدحالی کے خاتمے کے لئے مسلسل جدو جہد کریں، معاشرے میں پیدا ہونے والی منکرات کا قلع قمع کرنے میں پوری پوری سعی کریں اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور فرماں برداری میں مساوات کو ایک حقیقت بنادیں۔